ترتیب

تاثرات	. . . . .	۳
حضورِ رسالت مآبؐ میں	ڈاکٹر عبدالوہاب عزام	۷
غزالی کا نظریہ تعلیل	محمد حنیف زروی	۱۱
شاہ ولی اللہ کے سیاسی افکار	پروفیسر رشید احمد	۱۹
رواقیت	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۲۱
یونانی تصوف	بشیر احمد ڈار	۴۲
پاکستانی معاشرہ کی اسلامی اساس	ڈاکٹر سید عبداللہ	۵۱
کیا انکم ٹیکس زکوٰۃ ہے؟	محمد جعفر شاہ پھلواروی	۵۹
چھوٹی نیکی کو بھی کم نہ سمجھو	تشریح حدیث	۶۶
حروفِ مقطعات	م - ج	۶۹
مطبوعاتِ ادارہ	. . . . .	۷۳

طابع ناشر: شاہد حسین رزاقی مطبوعہ: حمایت اسلام پریس لاہور مقام اشاعت: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

محمد جعفر شاہ پھلواروی

تاثرات

انگریزوں نے برطانوی ہند کے لیے تعلیم کا جو نقشہ مرتب کیا تھا اس کا ایک بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی ذہنیت کو بدل دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ذہنیت غلامانہ ہونے کے بعد پوری زندگی ـــــ انفرادی و اجتماعی ـــــ متاثر ہوگی اور نتیجے کے طور پر قومی تمدن، ثقافت، تہذیب، اخلاق، افکار غرض پورا انداز زیست بدل جائے گا۔ نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ دوسری قوموں سے اس وقت بحث نہیں۔ ہم مسلمان قوم کی اثر پذیری کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ مسلمان قوم کا دین اور دین کا ایک بہت بڑا حصہ ـــــ اخلاق ـــــ متاثر ہو کر رہا۔ اور یہ تاثر بھی کچھ عجیب انداز کا تھا کہ حاکم قوم کی اچھی باتیں نہیں سیکھیں۔ بس یہی ہوا کہ اسلامی ذہن اور اسلامی اخلاق سے دور ہوتے چلے گئے۔ یہ تاثر اس قدر بیخ گرفتہ ثابت ہوا کہ آزاد پاکستان کے قیام کے بعد بھی ذہنی غلامی سے پوری طرح رہا نہ ہو سکے یہ صحیح ہے کہ آزادی کے بعد کسی محکوم قوم کی اخلاقی زندگی فوراً نہیں بدل جاتی۔ لیکن اگر دس گیارہ سال کے عرصے میں بھی نہ فقط یہ کہ بدل نہ سکیں بلکہ کچھ مزید اخلاقی خرابیوں میں مبتلا ہو جائیں تو تعجب ہونا چاہیئے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس درد کا درماں اور اس مرض کا مداوا کیا ہے؟ ہمارے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ جواب ہے دینی تعلیم جس کا لازمی جز ہے اخلاقی تربیت۔ مسلمان قوم کے مزاج کی افتاد دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے۔ اہل اسلام صرف خدا کے نام پر جمع ہو سکتے ہیں۔ انہیں صرف دینی تصورات ہی اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں۔ اپنی ہزار گراوٹوں کے باوجود اس قوم میں اب بھی اتنا دم خم ہے کہ اپنی عزیز ترین متاع کو اسلام ہی کے نام پر قربان کر سکتی ہے۔ اس سے زیادہ کشش رکھنے والی کوئی چیز اس کے لیے نہیں۔ اس لیے آغاز کار یہیں (دین) سے ہونا چاہیئے۔

دین کا جو تنگ اور محدود تصور عرصۂ دراز سے جڑ پکڑ چکا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی تعلیم اور دنیاوی تعلیم کو دو الگ الگ حقیقتیں تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ نے بارہا سنا ہوگا کہ "اسکول میں تیسرا گھنٹہ دینیات کا ہوتا ہے" یعنی اس گھنٹے سے پہلے اور بعد میں جو سبق جغرافیہ، تاریخ، سائنس، ریاضی وغیرہ کے پڑھائے جاتے ہیں وہ "بے دینی" کے گھنٹے یا یوں کہیئے کہ ایک گھنٹہ "دینیات" کا اور باقی سارے گھنٹے "دنیا دیات" یا "بے دینیات" کے ہوتے ہیں۔

پھر آگے چلیئے۔ آپ کو جا بجا بڑے بڑے سائن بورڈ ملیں گے جن پر مختلف دار العلوم یا جامعہ کے نام موٹے حرفوں میں لکھے ہوں گے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ دینی مدارس ہیں۔ یعنی دنیا سے ان کا کوئی سروکار نہیں۔ یہاں صرف دینی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور اگر آپ کچھ دنیاوی علوم بھی پڑھنا چاہیں تو پہلے یہاں چودہ پندرہ سال دینی علوم پڑھیئے

اس کے بعد اتنی ہی مدت کے لیے اسکولوں اور کالجوں میں دنیاوی علوم پڑھیئے۔ اس طرح آپ دینیات اور دنیا دیات دونوں کے عالم ہو جائیں گے۔ ان دینی مدارس میں دینیات کی کیا تعلیم ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے

(۱) قرآن۔ زیادہ سے زیادہ سورۂ بقرہ کی پرانی تفسیر بیضاوی یا بعض جگہ تفسیر جلالین جس کے تفسیری الفاظ خود قرآنی الفاظ سے زیادہ نہیں۔ مکمل قرآن ادبی، اخلاقی، تاریخی غرض کسی نقطۂ نگاہ سے بھی کسی دینی مدرسے میں مکمل نہیں پڑھایا جاتا۔

(۲) صحاح ستہ۔ اپنے تمام رطب و یابس سمیت اور وہ بھی کسی ایک فرقے کے زاویۂ نظر سے۔

(۳) مناظرہ۔ مثلاً رشیدیہ جس میں مناظرے کے اصول اور غالب آنے کے گر موجود ہیں۔

(۴) فلکیات۔ مثلاً تصریح الافلاک حالانکہ یہ بالکل پرانا اور فرسودہ ہو چکا ہے اور اس کے نظریات بالکل لایعنی ہو چکے ہیں۔

(۵) فقہ۔ مثلاً شرح وقایہ، جس میں ابھی تک لونڈی غلام کے مسائل اور وہ مسائل پڑھائے جاتے ہیں جن سے زندگی کو کوئی تعلق نہیں ہوتا اور مسائل کی جو موشگافیاں ہوتی ہیں وہ تو پڑھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۶) ادب۔ مثلاً معلقاتِ سبع کے عریاں قصائد۔ نفحۃ الیمن کی ہیجان انگیز حکایات ـــــ وغیرہ وغیرہ۔

بعض مدارس میں تاریخ اور جغرافیے اور ریاضی کی بھی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ بہرحال یہ ہیں وہ دینی علوم جو ان مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں اور یہ اس لیے دینیات ہیں کہ عربی زبان میں ہوتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں انگریزی میں ہوں تو ان کا تعلق کالج سے ہو جاتا ہے اور جو چیز کالج میں ہو وہ دینیات نہیں ہوتی بلکہ دنیا دیات ہوتی ہے۔

چونکہ ذہنوں پر یہی نقش کیا گیا ہے کہ دین ایک چیز ہے اور دنیا ایک جداگانہ شے ہے اس لیے نتیجہ بھی اسی کے مطابق نکلتا ہے۔ یعنی ان دینی مدارس سے جو فارغ التحصیل عالم ہو کر نکلتا ہے وہ صرف "دین" کے کام کا ہوتا ہے۔ دنیا سے اسے بظاہر مطلب نہیں ہوتا یعنی وہ نہ اکاؤنٹنٹ بن سکتا ہے نہ آڈیٹر، نہ کمانڈر نہ پائلٹ، نہ انجینئر نہ بزنس مین۔ نہ کارخانے دار نہ پروفیسر۔ نہ سفیر نہ وزیر۔ یہ تمام کام دنیا کے ہیں اور عالم ہوتا ہے دیندار۔ لہٰذا وہ صرف دینی کام کر سکتا ہے۔ یعنی نماز پڑھا سکتا ہے۔ وعظ کر سکتا ہے۔ مناظرہ کر سکتا ہے اور تکفیر کر کے تفریقِ اُمّت کا کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ غرض یہ ہیں دینی کام جو دینی مدارس کا فارغ التحصیل عالم کر سکتا ہے۔ باقی سارے کام دنیا کے ہیں جو "دنیا داری" ہے اور خلافِ تقویٰ ہے۔ "مسائل" صرف وہ ہیں جو شرح وقایہ میں ہیں۔ "مسائلِ زندگی" گویا بالکل الگ اور دنیا داری کی چیز ہے۔

ہم واشگاف لفظوں میں یہ اعلان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جس طرح اسلام میں ملوکیت اور پیشوائیت کا کوئی تصور نہیں اسی طرح دیندار مسلمان اور دنیا دار مسلمان کی تفریق کا بھی کوئی تصور نہیں۔ اس لیے "عالم دین" کے موجودہ تصور کا بھی ـــــ ایک الگ تھلگ طبقے کی حیثیت سے ـــــ اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام میں دین دنیا سے الگ کوئی شے نہیں بلکہ اسی دنیا کو خدا کی مرضی کے مطابق چلانے کا نام دین ہے۔ اس لیے ہماری تعلیم گاہیں الگ الگ دو دو ہونا درست نہیں تعلیم گاہ صرف ایک ہونی چاہیئے اور وہ سراپا دینی ہوگی۔ جتنے علوم پڑھائے جائیں گے وہ سب دینی ہی متصور ہوں گے

جتنے گھنٹے ہوں وہ سب دینیات ہی کے گھنٹے ہوں گے کیونکہ دنیا کے جتنے علوم و فنون بھی ہیں یا ہو سکتے ہیں وہ سب عین دینی اور اسلامی ہوں گے بشرطیکہ متعلمین کا ظرف اور روش دینی و اسلامی ہو۔ "عالم یا عالم دین" کا لفظ بھی ہمارا خود ساختہ ہے۔ عالم ہر وہ مسلم ہے جو کسی علم کو حاصل کرے۔ کوئی حدیث کا عالم ہے کوئی ہائی جین کا۔ کوئی تفسیر کا عالم ہے کوئی عمرانیات کا۔ کوئی فقہ کا عالم ہے اور کوئی تاریخ کا۔ کوئی فرائض کا عالم ہے کوئی سائنس کا۔ غرض جو علم بھی انسان حاصل کرتا ہے وہ اس کا عالم ہے۔ صرف مدرسے کا فارغ التحصیل یا صرف فقہ کا واقف کار ہی عالم نہیں۔ عالم کے معنی اسکالر کے ہیں خواہ کسی علم و فن کا اسکالر ہو۔ اس تصور کی بنیاد پر ہماری تعلیم گاہ قائم ہونی چاہیئے جہاں دین اور دنیا کی کوئی تفریق نہ ہو۔ اور دینی و دنیوی تعلیم کی ثنویت کو یک لخت ختم کر دیا جائے۔

اس کے ساتھ ایک بڑا ہی ضروری، اہم اور بنیادی مرحلہ یہ رہ جاتا ہے کہ اس جامع تعلیم کے ساتھ ان کی بڑی اعلیٰ اخلاقی تربیت بھی ہو کیونکہ اخلاق کے بغیر کوئی قومی کردار نہیں پیدا ہو سکتا۔ اور دین کا سارا تصور ہی اعلیٰ کردار کے بغیر بے معنی سا ہو جاتا ہے۔ علوم و فنون کی غیر ضروری منطقی موشگافیوں سے کہیں زیادہ یہ ضروری ہے کہ متعلمین کے اندر اخلاقی قدروں کی اہمیت جاگزیں ہو جائے اور وہ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ انسانیت اور اخلاق کے بغیر علمی زندگی بے معنی ہوتی ہے۔ العالم بلا عمل کالبحر بلا ماء۔ بے عمل اہل علم ایسا ہی ہے جیسے بے پانی کا دریا (حدیث) اور دینی زندگی یہ نہیں کہ محض نماز روزے کی پابندی کر لی جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ اس سے تمام اخلاقی بدعنوانیاں معاف ہو جاتی ہیں بلکہ خدا سے رابطہ قائم ہی اس وقت ہوتا ہے جب خدا کے بندوں سے رابطہ صحیح ہو۔ اخلاقی زندگی کے بغیر دینی زندگی کے کوئی معنی ہی نہیں ہوتے۔ اخلاق کی کسی کتاب کو محض اس لیے رٹ لینا کہ امتحان میں پاس ہو جائیں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کا امتحان تو عملی ہونا چاہیئے اور اسی پر پاس اور فیل ہونے کا دارومدار ہونا چاہیئے۔

اس کے لیے گناہ و ثواب کا موجودہ غلط تصور بھی بدلنا ہوگا۔ ہمارے موجودہ معاشرے میں مرا ہوا جانور کھا لینا تو بہت بڑا گناہ ہے لیکن چغل کھانے کو وہ اہمیت حاصل نہیں حالانکہ از روئے قرآن اس کا درجہ وہی ہے جو اپنے بھائی کی لاش کو نوچ کھانے کا۔ اسی طرح ہمارے ہاں وظیفہ پڑھنے کا بڑا ثواب ہے لیکن خدمت خلق کو وہ درجہ حاصل نہیں حالانکہ ارشاد نبوی میں بہترین انسان اسے قرار دیا گیا ہے جس سے دوسروں کو نفع پہنچے۔ غرض اس قسم کے بے شمار غلط تصورات جو گناہ و ثواب سے وابستہ ہیں ہمارے معاشرے میں رائج ہیں جن کو یکسر بدلے بغیر اخلاقی اقدار کی اہمیت واضح نہ ہو سکے گی۔ اور ان پر پوری توجہ کرنا نہایت ضروری ہے۔